ہندوستان میں اشاعتِ اسلام
چند اعتراضات کا جائزہ

ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی

ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کے سلسلے میں جو اعتراضات کیے جاتے ہیں وہ بالعموم وہی ہیں جو پوری دنیا میں اسلام کے پھیلنے کے سلسلے میں کیے جاتے ہیں۔ مسلمان فرماں رواؤں نے دنیا کے جن جن علاقوں میں حکم رانی کی ان میں بیش تر کے سلسلے میں یہی الزام عائد کیا جاتا ہے کہ ان حکم رانوں نے تلوار کے ذریعہ اسلام کو پھیلایا۔[۱] یہ اعتراضات ہندوستانی افق پر زیادہ واضح نظر آتے ہیں۔ مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ ان اعتراضات کی ابتدا اس وقت ہوئی جب مسلمان حکم رانوں کی تلوار زنگ آلود ہو گئی تھی۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ (م ۱۹۷۹ء) اس پہلو پر بہت اچھے انداز میں روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دور جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کے لیے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں ان میں سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خون خوار مذہب ہے اور اپنے پیروؤں کو خوں ریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس بہتان کی اگر کچھ حقیقت ہوتی تو قدرتی طور پر اسے اس وقت پیش ہونا چاہیے تھا، جب کہ پیروانِ اسلام کی شمشیر خارا شگاف نے کرۂ زمین میں ایک تہلکہ برپا کر رکھا تھا اور فی الواقع دنیا کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید ان کے یہ فاتحانہ اقدامات کسی خوں ریز تعلیم کا نتیجہ ہوں۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس بہتان کی پیدائش آفتابِ عروجِ اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی۔ اس کے خیالی پتلے میں اس وقت روح پھونکی گئی جب کہ اسلام کی تلوار تو زنگ کھا چکی تھی، مگر خود اس کے موجد یورپ کی تلوار بے گناہوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی اور اس نے دنیا کی

کم زور قوموں کو اس طرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اژدہا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ڈستا اور نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی تو وہ سوال کرتی کہ جو لوگ خود امن و امان کے سب سے بڑے دشمن ہوں، جنہوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرہ کو رنگین کر دیا ہو اور جو خود دوسری قوموں پر ڈاکے ڈال رہے ہوں، آخر انہیں کیا حق ہے کہ اسلام پر وہ الزام عائد کریں جس کی فردِ جرم خود ان پر لگنی چاہیے؟ کیا اس مورخانہ تحقیق و تفتیش اور عالمانہ بحث و اکتشاف سے ان کا یہ منشا تو نہیں کہ دنیا کی اس نفرت و ناراضی کے سیلاب کا رخ اسلام کی طرف پھیر دیں جس کے خود ان کی اپنی خوں ریزی کے خلاف امنڈ کر آنے کا اندیشہ ہے۔''[۱] الف

ہندوستان میں اشاعت اسلام پر اعتراض کرنے والوں کو دو گروہ اور دو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا گروہ انگریزوں کا ہے جنہوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کی اور ان کے زیر سایہ عیسائی مشنریوں نے تبلیغ عیسائیت کی منصوبہ بند کوششیں کیں۔ اسلام ان کے مقاصد کی تکمیل کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ تھا، چنانچہ انہوں نے اسلام پر عیسائیت کی بالاتری دکھانے کے لیے اس کے مختلف پہلوؤں پر جارحانہ حملے کیے اور اسلام کو ایک خوں آشام، غیر متمدن اور فرسودہ مذہب ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اسی زمانے میں انگریزوں کے زیر اثر بعض ہندوؤں نے بھی اسلام کے خلاف مناظرانہ محاذ آرائی کی۔ دوسرا گروہ اس ملک کے غیر مسلموں کا ہے۔ ان کے اعتراضات کا سلسلہ بالخصوص ہندوستان کی آزادی کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اگرچہ پہلے اس میں اتنی شدت نہ تھی جتنی کہ بعد کے زمانے میں یا عہد حاضر میں پائی جاتی ہے۔ ایک خاص جماعت جو ہندوتو کی علم بردار ہے، اس میں پیش پیش ہے۔ کیوں کہ وہ ملک میں ہندو مذہب اور ہندو تہذیب کا غلبہ چاہتی ہے۔ یہ لوگ باوجود اپنی تمام تر کوششوں کے نہ تو مسلمانوں کو متاثر کر سکے ہیں اور نہ اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کو اسلامی تہذیب کے مقابلہ میں برتر ثابت کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس لیے اب انہوں نے یہ منصوبہ بنایا ہے کہ اسلام میں زبردستی خامیاں نکالی جائیں اور پروپیگنڈے کے زور پر عوام کے

سامنے اسے بھیانک شکل میں پیش کیا جائے۔اس کے لیے اب انہوں نے ٹی وی چینلوں، ڈراموں، افسانوں،فلموں ،قصوں، کہانیوں اور جھوٹی تاریخ نویسی کا سہارالیا ہے اور وہ مختلف قسم کے بے بنیاد بلکہ خیالی مناظر کے ذریعہ پروپیگنڈہ کرکے لوگوں کو گمراہ کررہے ہیں۔

اعتراضات کے مصادر پر ایک نظر

ہندوستان میں اشاعتِ اسلام سے متعلق بالعموم جو اعتراضات کیے جاتے ہیں، ان کا سرچشمہ وہ لٹریچر ہے جو انگریزوں نے ایک سوچی سمجھی پالیسی کے تحت تیار کیا، جس کا خاص مقصد یہ تھا کہ یہاں کی دو بڑی قومیں ہندوؤں اور مسلمانوں (جو عرصہ دراز سے پرامن ماحول میں روادارانہ طریقے سے زندگی بسر کرتے آرہے ہیں) کے درمیان منافرت کی آگ بھڑکا دی جائے، تاکہ وہ ایک دوسرے سے نبرد آزما رہیں اور انہیں اتنی فرصت نہ ملے کہ ہماری جابرانہ اور ظالمانہ روش کی طرف توجہ کرسکیں۔ چنانچہ جب اس جذبہ کے تحت ہندوستان کی تاریخ رقم کی گئی تو ایک طرف مسلمان بادشاہوں کو ظالم و جابر ٹھہرایا گیا کہ وہ ہندوؤں کے سخت دشمن تھے، اس کے ساتھ یہ بتایا گیا کہ وہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں پر مظالم ڈھاتے اور ان کے مذہبی مقامات کو مسمار کرتے تھے، یہ شوشہ بھی چھوڑا گیا کہ شیواجی مسلمانوں کے حق میں بڑے سخت واقع ہوئے تھے، کیوں وہ پکے اور سچے ہندو تھے۔اس قسم کے اعتراضات سب سے پہلے بمبئی کے گورنر الفسٹن کے قلم سے صفحۂ قرطاس پر آئے جو بہت جلد ملک کے کونے کونے میں پھیلا دیے گیے۔یہاں تک کہ اسے شامل نصاب کرکے بچوں کو بھی پڑھایا جانے لگا۔[۲]

ہسٹری آف انڈیا اور آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا تاریخی اعتبار سے بڑی اہم کتابیں سمجھی اور پڑھی جاتی ہیں۔یہ ڈاکٹر ونسنٹ اے اسمتھ کی سخت عرق ریزی کا نتیجہ تھیں اور بڑی لاگت سے زیورطبع سے آراستہ ہوئیں۔ان کی انفرادیت اور اہمیت اہل علم کے نزدیک مسلّم ہے، مگر اس کتاب کے مطالعہ سے جہاں بہت سے اہم گوشے واضح ہوتے ہیں وہیں اس میں زہریلے بیانات بھی پڑھنے کو ملتے ہیں۔اکثر معمولی واقعات کو فرقہ وارانہ رنگ دے کر مسلم حکم رانوں کی خوبیوں پر پردہ ڈالا گیا اور خامیوں کو مبالغہ کے ساتھ بیان

کیا گیا ہے اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مسلمان سلاطین متعصب اور تنگ نظر تھے، ان کا مقصد ہندوؤں کو تباہ کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ انہوں نے ہندوستان میں اکثر مسلمانوں کے آباء واجداد کا مذہب خوف یا لالچ سے تبدیل کروایا تھا۔ انگریزوں نے آکر ہندوؤں کو ان کے پنجۂ ظلم سے نجات دلائی۔

الیٹ اور ڈاوسن کے ذریعے ہندوستان کی جو تاریخ لکھی گئی ہے اس میں بھی فرقہ وارانہ روش اختیار کی گئی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلّی نے یوں تبصرہ کیا ہے:

''خود ہندوستان میں برسوں پہلے سر ہنری الیٹ اپنی مشہور کتاب 'ہندوستان کی تاریخ خود اپنے مورخین کی زبانی' ترتیب دے چکے تھے اور ان کے انتقال کے بعد ڈاوسن کی کوششوں سے شائع بھی ہو چکی تھی۔ اس کتاب کا بنیادی مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ برصغیر میں مسلمانوں کی حکومت ایک بے حد جابرانہ اور انتہائی ظالمانہ حکومت تھی، جس کا عدل و انصاف سے کوئی واسطہ نہ تھا اور جس کے زیر سایہ بنیادی انسانی اقدار قطعی غیر محفوظ تھیں۔ سازش، شراب نوشی، عیاشی اور قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ عیش وطرب کے لوازم مہیا کرنے کے لیے عوام کا بے دردانہ استحصال، جس کا نشانہ خصوصاً غیر مسلم عوام ہوتے تھے، اس حکومت کا نشان امتیاز تھا۔ معاشی استحصال، سماجی نابرابری اور مذہبی رواداری کا یکسر فقدان اس عہد کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ غرض اس کتاب کے صفحات سے مسلم دورِ حکومت کی ایک ایسی تصویر ابھرتی ہے جو کسی بھی طرح قابلِ فخر نہیں کہی جاسکتی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے بڑی مہارت اور چابک دستی سے اقتباسات کو ایک خاص ترتیب سے اکٹھا کیا گیا ہے اور انہیں اپنے مخصوص سیاق وسباق سے الگ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ اقتباسات کے انتخابات میں یہ بات خاص طور سے ذہن میں رکھی گئی ہے کہ صرف ایسے حصوں کو منتخب کیا جائے جن سے مسلم حکمرانوں اور ان کے نظام حکومت کی نہایت مکروہ اور گھناؤنی تصویر ابھر کر سامنے آئے۔''[۳]

اسی طرح ایم۔اے۔ ٹائیٹس نے مسلمان بادشاہوں کے متعلق جو زہریلا مواد

قارئین کی نذر کیا ہے وہ بھی بڑا دل خراش ہے۔ اسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے سوچی سمجھی پالیسی کے تحت ایک لائحہ عمل تیار کیا تھا، جس پر بعد تک عمل ہوتا رہا۔ اس میں اس نے بالخصوص محمد بن قاسم اور اورنگ زیب سے متعلق بہتان تراشی کرتے ہوے لکھا ہے کہ محمد بن قاسم نے سندھ میں مندروں کے انہدام کا جو منصوبہ بند پروگرام شروع کیا تھا، وہ عہد عالم گیری تک جاری رہا۔[۴]

عہد وسطیٰ کی تاریخ لکھنے کی طرف ہندوؤں نے توجہ نہ دی۔ سوائے کلہن کی 'راج ترنگی' کے کوئی اہم تاریخی کتاب ہندوؤں کے یہاں نہیں پائی جاتی اور وہ بھی کشمیر کے حالات سے تعلق رکھتی ہے۔ تاریخ نویسی کا کام مسلمانوں نے ابتدا سے کیا ہے اور یہ فن ہندوستان میں سلاطین کے عہد میں عروج پر پہنچا۔ کم وبیش اکثر فرماں رواؤں کے زمانہ کی تاریخ کسی نہ کسی حد تک رقم ہوئی، جس کی زبان فارسی، عربی اور ترکی تھی۔ انگریز شاہ جہاں کے زمانہ سے ہندوستانی افق پر ابھرے۔ اس وقت تک ان کی حیثیت اس ملک میں بس اتنی تھی کہ سلاطین اور امرا کو جب کبھی ان کی عیاری اور مکّاری کا علم ہوتا تو ان کی گوش مالی کر دیتے اور وہ ادھر سے ادھر منتشر ہو جاتے تھے۔ انھوں نے بتدریج ہندوستان میں قدم جمائے۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ اس افراتفری کے زمانے میں انگریزوں نے کیوں کر اور کس طرح عربی، فارسی اور ترکی زبانوں پر عبور حاصل کر لیا کہ وہ اپنی تاریخی کتابوں میں مسلمانوں کی تاریخ اور دوسری کتابوں کا حوالہ بڑے کرّ وفر سے پیش کرتے ہیں اور پھر مسلمان مورخین نے اپنی تاریخی کتابوں میں اپنے بادشاہوں کے ناکردہ مظالم کا ذکر آخر کس مقصد سے کیا ہے، جن کا حوالہ انگریز مورخوں نے دیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اس عہد میں جو تاریخی کتابیں تھیں ان میں سے اکثر کتابیں آج بھی پائی جاتی ہیں، جن میں ان بادشاہوں کے مظالم کا ذکر نہیں ہے اور اگر کہیں کہیں اس طرح کی کچھ باتیں پڑھنے کو مل بھی جاتی ہیں تو ان کے سیاق وسباق سے واقعہ کو جوڑ کر نتیجہ نکالا جانا چاہیے۔

انگریز مورخوں کی دروغ بیانی اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ وہ اپنے

حوالوں میں مقامی روایت اور گزیٹیر کا حوالہ کثرت سے دیتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہیں کب اتنا وقت میسر آ گیا کہ انہوں نے ہندوستان کے ہر علاقے کا سروے کر کے اس کا مکمل ریکارڈ جمع کر لیا۔ یہ بات درست ہے کہ اوپر جن کتابوں کا ذکر ہوا ہے ان میں بیش تر کتابیں ۱۹ رویں صدی کے اختتام تک یا آزادی سے قبل زیور طبع سے آراستہ ہو چکی تھیں۔ اس وضاحت سے راقم کا مدعا یہ ہے کہ انگریزوں کی لکھی ہوئی کتابیں تاریخی استناد سے خالی ہیں اور مقامی روایات کی جو کثرت ہے وہ مشکوک ہے۔[۱۵] اس لیے تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو ان باتوں کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے اور مطالعہ کے وقت بالخصوص ان کے تاریخی استناد کو ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔

اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ انگریزوں کو اگر ان زبانوں پر عبور حاصل تھا تو پھر انہوں نے تصنیف و تالیف اور تراجم کے جو ادارے قائم کیے ان میں مسلمان عالموں کی مدد حاصل نہ کرتے۔ اگر ان کے معاش کی انہیں فکر تھی تو دوسرے اہم شعبوں میں مسلمانوں کی جو قلت ہو گئی تھی اس کا کیا جواز ہو سکتا ہے؟ دراصل ہندوستان کی تاریخ اور تذکروں کے تراجم وغیرہ پر انہوں نے جو محنت کی اس سے اسلام کی محبت کے بجائے عناد کا پہلو ظاہر ہوتا ہے۔ کیوں کہ انہوں نے اپنے مقاصد کی کامیابی کے لیے واقعات کو اس انداز میں توڑ مڑور کر پیش کیا ہے کہ اصل واقعہ کی صورت مسخ ہو کر رہ گئی ہے اور فرقہ واریت کی بو اس سے ظاہر ہوتی ہے۔ ان کے عزائم کا پردہ فاش کرتے ہوئے نو مسلم مفکر علامہ اسد لکھتے ہیں:

''یورپین کا رویہ اسلام کے بارے میں اور صرف اسلام ہی کے بارے میں دوسرے غیر مذاہب اور تمدنوں سے بے تعلقی کی ناپسندیدگی ہی نہیں، بلکہ گہری اور تقریباً بالکل مجنونانہ نفرت ہے۔ یہ محض ذہنی نہیں ہے، بلکہ اس پر شدید جذباتی رنگ بھی ہے۔ یورپ بدھشٹ اور ہندو فلسفوں کی تعلیمات کو قبول کر سکتا ہے اور ان مذہبوں کے متعلق ہمیشہ متوازن اور مفکرانہ رویہ اختیار کر سکتا ہے، مگر جیسے ہی اسلام کے سامنے آتا ہے، اس کے توازن میں خلل پڑ جاتا ہے اور جذباتی تعصب آجاتا ہے۔ بڑے سے بڑے یورپین مستشرقین بھی اسلام کے متعلق لکھتے ہوئے غیر معقول جانب داری کے مرتکب ہو گئے ہیں .....

اس طریقۂ عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپ کے مستشرقین کے ادب میں ہمیں اسلام اور اسلامی معاملات کی بالکل مسخ شدہ تصویر ملتی ہے۔ یہ چیز کسی ایک خاص ملک میں محدود نہیں، بلکہ جرمنی، روس، فرانس، اٹلی، ہالینڈ، غرض ہر جگہ جہاں یورپین مستشرقین نے اسلام سے بحث کی ہے، انہیں جہاں کہیں بھی کوئی واقعی یا محض خیالی ایسی بات نظر آتی ہے جس پر اعتراض کیا جاسکے، وہاں ان کے دل میں بدنیتی کی مسرت کی گدگدی ہونے لگتی ہے۔''[۶]

فرقہ پرستی کی آگ بھڑکانے میں بعض ہندوستانی مورخین نے بھی اپنا کردار انجام دیا ہے۔ مثلاً مشہور مورخ سر جادو ناتھ سرکار نے اورنگ زیب کے نام سے ۵/جلدوں میں کتاب لکھی۔ اس میں اس نے جہاں ایک طرف اورنگ زیب کے حالات، افکار، ملکی نظم ونسق، علم اور علما پروری اور کارناموں کو بڑے دل کش انداز میں بیان کیا ہے، وہیں بعض جگہوں پر اسلام، مسلمان اور اورنگ زیب کے عادات وخصائل پر جارحانہ حملے بھی کیے ہیں۔ اس نے اپنی کتاب کی جلد سوم کا ایک پورا باب ''اسلامک اسٹیٹ چرچ'' کو اس بحث کے لیے وقف کردیا ہے کہ اسلام ایک وحشیانہ مذہب ہے، جو اپنے متبعین کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ لوٹ مار اور خوں ریزی کو مذہبی فرض سمجھو، یہ دنیا کے امن کا دشمن ہے اور اس کی رو سے رواداری ناجائز ہے، حکومت مغلیہ مکمل قزاقی تھی، مسلمانوں کی حکومت میں غیر مسلم ابھر نہیں سکتے تھے۔ اورنگ زیب کی عدم رواداری کا ذمہ دار اسلام تھا، کیوں کہ وہ شجر اسلام کا ایک پھل تھا، جب درخت ہی کڑوا ہے تو پھل لامحالہ کڑوا ہوگا۔[۷]

اس کتاب کی زہر افشانی کے متعلق ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد لکھتے ہیں:

''دوسری کتاب مشہور تاریخ داں جادو سرکار (سر جادو ناتھ سرکار) کی لکھی ہوئی ہندی اور انگریزی زبانوں میں موجود ہے، ویسے 'سر' کا خطاب انگریزوں نے زیادہ تر ایسے ہی لوگوں کو دیا، جنہوں نے انگریزوں کے خیالات و بہبودی کا خیر مقدم دل کھول کر کیا۔ جادو ناتھ سرکار کی کتاب پڑھنے پر ہمیں بڑی دل چسپ باتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ سرکار صاحب کوئی ایسا قدم اٹھانے سے باز نہیں آتے ہیں، محض یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اورنگ زیب مغلیہ عہد کا بدترین بادشاہ تھا، جب کہ ہمیں انہی کی کتاب میں

اورنگ زیب سے متعلق ایسی باتیں دیکھنے کو ملتی ہیں جن پر غور کرنے سے ہم آسانی سے اس نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں کہ وہ اتنا کٹّر، ظالم اور متعصب نہیں تھا جتنا بتایا گیا ہے۔اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے اگر ہم سرکار صاحب کی کتاب میں شائع اورنگ زیب کے فرمانوں' کا مطالعہ کریں تو بات کافی حد تک سمجھ میں آسکتی ہے۔''۸

بعض اور مورخین مثلاً ایشوری پرساد، سری رام شرما، آشروادی لال وغیرہ نے مغل بادشاہوں کی مذہبی پالیسی اور میڈول انڈین کلچر کے نام سے عہد وسطیٰ کے بادشاہوں کی تاریخ لکھی، ان میں بھی کہیں کم اور کہیں زیادہ بیش تر حکم رانوں کی سیاسی و مذہبی پالیسی کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے اور اس کے ضمن میں پورے اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ ان بادشاہوں کو اسلام پھیلانے کے لیے جبر وتشدد کی پالیسی اپنانے میں کوئی مضایقہ نہیں رہا۔۹

اس قسم کا زہریلا لٹریچر عوام کے سامنے آیا تو بلا تفریق مذہب وملت لوگ ان سلاطین کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔آج بھی تاریخ کے بعض طالب علموں کے ذہنوں سے یہ غلط تاثر زائل نہ ہوسکا ہے۔ان میں سے کچھ طالب علم تحقیق وتخریج کے میدان سے گزرتے ہیں تو انہیں اصل صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کتابوں میں بالخصوص الیٹ کی تاریخ نے عوام کے ذہن میں ایسا تاثر پیدا کیا ہے کہ آج بھی جب اس کے خلاف کوئی بات کہی جاتی ہے تو وہ شک کے ساتھ سنی جاتی ہے۔

معترضین کی تضاد بیانی

ہندوستان کے مسلم فرماں رواؤں کے بارے میں معترضین کے متضاد بیانات ملتے ہیں۔ان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آخر ان فرماں رواؤں کا رویہ اپنی رعایا کے ساتھ ایک ہی وقت میں متضاد کیوں کر ہوسکتا ہے۔یا تو انہوں نے ہندوستان میں ظلم و بربریت کی روش اختیار کی ہوگی یا پھر انسانی ہمدردی اور رواداری کے اصولوں کو اپنایا ہوگا۔لہٰذا ان بیانات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان بادشاہوں کے متعلق بیش تر مورخوں نے تعصب سے کام لے کر پوری تاریخ کو مشکوک بنادیا ہے۔چنانچہ جس اورنگ زیب کو

سر جادوناتھ سرکار نے 'شجرِ اسلام کا ایک کڑوا پھل' کہا ہے، اس کی دوسری رائے اورنگ زیب کے متعلق یہ بھی ہے:

''جسمانی ہمت اور تمکنت کے علاوہ اس نے اوائل زندگی ہی سے بادشاہت کی مشقتوں اور خطروں کو اپنا شیوہ بنالیا تھا اور اس عظیم الشان عہدہ کے لیے احترام ذات، معرفت ذات اور ضبط نفس سے اپنے کو تیار کیا۔ بادشاہوں کے لڑکوں سے بالکل مختلف اورنگ زیب ایک وسیع النظر اور سلیم الفطرت عالم تھا اور زندگی کی آخری سانس تک کتابوں سے محبت کرتا رہا۔ اگر ہم قرآن شریف کے ان متعدد نسخوں کو نظر انداز بھی کر دیں جن کو اس نے اپنے ہاتھوں سے ایک عابد کی سرگرم ریاضت کے ساتھ لکھا، تو بھی ہم اس کو فراموش نہیں کر سکتے کہ وہ ایک مشغول حکم راں ہونے کے باوجود اپنی قلیل فرصت کو عربی کی فقہی اور مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں شوق سے گزارتا اور پرانے اور نادر مخطوطات مثلاً نہایہ، احیاء العلوم اور دیوان صائب کو کتابوں کے ایک کامل عاشق کی ہوس سے ڈھونڈتا۔ اس کے کثیر رقعات، اس کی فارسی شاعری اور عربی ادب پر قدرت کی دلیل ہیں، کیوں کہ وہ ہمیشہ اپنے خط کو مناسب اشعار و اقتباسات سے مزین کرتا ہے۔ عربی اور فارسی کے علاوہ ترکی اور ہندی بھی آزادی کے ساتھ بول سکتا تھا۔ یہ اسی کی جودت طبع اور سرپرستی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے پاس ہندوستان میں مسلمانوں کے قانون کا سب سے بڑا خلاصہ فتاویٰ عالم گیری ہے جو نہایت مناسب طور پر اسی کے ساتھ منسوب ہے اور جس نے بعد کے عہد میں اسلامی نظام عدل کو واضح طور پر آسان کر دیا۔'' [۱۰]

یہی مورخ محمد بن قاسم کی فتوحات اور ان کی سیاسی بصیرت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''شروع کے عرب فاتحوں خصوصاً سندھ کے فاتحوں نے یہ عقل مندانہ اور مفید حکمت عملی اختیار کر رکھی تھی کہ وہ غیر مسلموں کی عبادت گاہوں اور مذہبی مراسم کو مطلق نہ چھیڑتے۔ جب وہ کسی شہر پر قبضہ کر لیتے تو وہاں کی غیر مسلم آبادی کو اسلام قبول کرنے کو کہتے، اگر وہ قبول کر لیتے تو ان کو وہی حقوق حاصل ہو جاتے جو فاتحوں کے ہوتے، ورنہ پھر ان

کو جزیہ ادا کرنا پڑتا، جس کے بعد ان کو اپنے مذہب کے مراسم ادا کرنے کی اجازت ہوتی۔''[۱۱]

سر جادوناتھ نے مجموعی طور پر تمام مغل حکم رانوں کی پالیسی اور ان کے انتظام مملکت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

''مغل ایمپائر کے سبھی صوبوں پر بالکل ایک ہی طرح انتظامی مشنری کے ذریعہ ٹھیک ایک ہی طرح کے ضابطوں اور سرکاری خطابوں کے ساتھ حکومت ہوتی تھی۔ فارسی واحد زبان تھی جو سرکاری ریکاڈس، فرمان، اسناد، زمینوں کے عطیات، حمل ونقل کے اجازت ناموں، مراسلات اور رسیدوں کے اجرا میں استعمال ہوتی تھی۔ صرف ٹکسال شہروں کے ناموں کے فرق کے ساتھ ایک ہی نام اور نوعیت کے اور کھرے پن میں ایک ہی طرح کے سکوں کا حامل، ایک ہی طرح کا مالیاتی نظام سلطنت بھر میں رائج تھا۔ عہدہ داروں اور فوجیوں کو برابر ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں تبدیل کیا جاتا تھا۔ اس طرح ایک صوبہ کا باشندہ اپنے کو کسی دوسرے صوبے میں تقریباً گھر ہی کی طرح مطمئن محسوس کرتا تھا۔ تجار اور سیاح بڑی آسانی سے ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں آتے جاتے رہتے تھے اور سبھی اس ملک کی شاہی (سیاسی) وحدت کو خوب سمجھتے تھے۔''[۱۲]

کیمبرج ہسٹری کے مصنف نے اپنی دوٹوک رائے اس انداز میں پیش کی ہے:

''مسلم مورخین نے کسی بغاوت کو فرو کرنے یا کسی قلعہ، شہر یا گاؤں پر قبضہ کرنے میں، انہیں جلانے اور پورے ضلع کو برباد کر دینے کا واقعہ اس رجزیہ انداز میں بیان کیا ہے کہ اگر ہمارے پاس ثبوت نہیں ہوتا کہ واقعہ اس طرح ہو ہی نہیں سکتا تو ہم ان سے مغالطہ میں پڑ جاتے اور یقین کرنے لگتے کہ شمالی ہندوستان پر مسلمانوں کا ابتدائی غلبہ ایک ایسا مقدس جہاد تھا جو بت پرستی کو ختم کرنے اور اسلام کی تبلیغ کے لیے شروع کیا گیا تھا۔ محمود اور اس کے بعد سبھی حکم رانوں نے جب بھی ایسا کرنا اپنے حق میں موزوں سمجھا، ہندو جاگیرداروں اور زمین داری کی اطاعت کو قبول کرلیا، انہیں اپنا منصب دار بنایا اور ان کے موروثی علاقوں کو ان کے قبضے میں رہنے دیا۔''[۱۳]

الفسٹن نے 'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو' کی پالیسی اپنائی تھی اور مسلمانوں کو

ہندوؤں کا اور ہندوؤں کو مسلمانوں کا حریف ٹھہرایا تھا اور پھر اپنے نظریات کو کتابی شکل دے کر اسکول کے نصاب میں شامل کر دیا تھا۔ مگر وہ بھی مسلمان حکم رانوں کے انصاف، مواخات اور رواداری کا اعتراف کرتا ہوا نظر آتا ہے:

''ان (مسلمانوں) کی حکومتوں میں ہندوؤں کے مندروں اور دھرم شالاؤں کی حفاظت کی جاتی تھی۔ برندابن، گوردھن اور متھرا کے مندروں کو شاہی خزانے سے مدد کی جاتی تھی۔ متھرا ضلع کے گوردھن میں ہری دیو جی کا مندر ہے۔ یہ ۱۵۰۰ء میں بنا۔ احمد شاہ کے ایک دستخطی فرمان سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہوں کی اور سے مندر کے خرچ کے لیے روپیہ ملتا تھا۔''[۱۴]

ڈاکٹر ایشوری پرساد سابق پروفیسر الٰہ آباد یونیورسٹی محمود کی عسکری اور سیاسی بصیرت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تاریخ میں محمود کا مقام طے کرنا مشکل کام نہیں۔ اپنے زمانے کے مسلمانوں کے سامنے وہ غازی اور دین کا حمایتی تھا، جس نے مشرکوں کے ملک سے بت پرستی ختم کرنے کی کوشش کی اور آج کے ہندوؤں کی نگاہ میں وہ ایک وحشی اور ظالم حقیقی ہوا تھا، جس نے ان کی انتہائی مقدس عبادت گاہوں کو برباد کیا اور وحشیانہ طور پر ان کے مذہبی احساسات کو مجروح کیا۔ لیکن ایک غیر جانب دار محقق جو اس زمانے کے خصوصی حالات کو دھیان میں رکھے گا تو لازمی طور پر دوسرا فیصلہ دے گا۔ محمود بلاشبہ اپنے ساتھیوں کا ایک عظیم رہ نما تھا۔ وہ اپنی عقل سے کام کرنے والا معقول اور ایمان دار حکم راں، ایک جری اور لائق سپاہی، منصف مزاج، ادب کا سرپرست اور دنیا کے سب سے بڑے بادشاہوں میں شمار کیے جانے کے لائق تھا۔''[۱۵]

ہندوؤں کی عبادت گاہوں کے لیے سلاطینِ ہند کے فرامین

مسلم سلاطین ہند نے غیر مسلموں کے ساتھ جو رواداری برتی اور ان کے مذہبی مقامات کے سلسلے میں جو مثبت رویہ اپنایا وہ ہر شک وشبہ سے بالا تر ہے۔ انہوں نے اپنی سلطنت میں دیگر غیر مذاہب کے ماننے والوں کی عبادت گاہوں کے لیے بڑی تعداد میں

آراضی وقف کیں، تاکہ ان کی آمدنی سے ان عبادت گاہوں کا نظم ونسق اچھی طرح انجام پاسکے۔ اورنگ زیب نے تو کچھ مندروں کے لیے گھی اور تیل بھی مہیا کرایا، تاکہ شام ہوتے ہی انھیں روشن کیا جاسکے۔[۱۶] ایسے فرامین کی کثیر تعداد ہے جو ملک کے مختلف مقامات کے مندروں کے پروہت اور ان کے اہل خاندان کے پاس آج بھی پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے فرامین کو بشمبر ناتھ پانڈے نے مختلف مقامات سے حاصل کرکے اور بڑی چھان بین کے بعد اپنی کتاب میں شائع کردیا ہے۔[۱۷] ان فرامین کے مطالعہ سے متعصب مورخوں کا تعصب واضح ہوجاتا ہے۔ یہ ان برادران وطن کے لیے لمحۂ فکریہ ہے جو مسلمان فرماں رواؤں کو بدنام کرتے ہیں اور انہیں ظالم وجابر کہنے میں ذرہ برابر بھی عار محسوس نہیں کرتے۔

مندروں کے انہدام کی حقیقت

مسلمان حکم رانوں پر مندر شکنی کا الزام لگایا جاتا ہے اور اس سے متعلق بعض واقعات بھی بیان کئے جاتے ہیں۔ ایک طویل عرصہ سے اس مسئلہ کو اچھالنے کی جو مہم چھیڑی گئی ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ کچھ معاصر مورخین کے خلاف واقعہ اور غیر محتاط بیانات کی وجہ سے بھی غلط تاثرات ابھرتے ہیں۔ برطانوی مورخین اور خود ہندوستانی مورخین واہل قلم کے ایک طبقہ نے اس زمانہ کے مزاج یا درباری مورخین کے انداز تحریر کو دانستہ یا نادانستہ اس باب میں مسلم حکومتوں کے طرز عمل کی ترجمانی قرار دیا ہے، یا اس سے متعلق واقعات کو ان کے پس منظر سے الگ کرکے مبالغہ کے ساتھ پیش کیا ہے وہ نہ صرف علمی بددیانتی اور تاریخ کو مسخ کرنے کی بدترین مثالیں ہیں، بلکہ ملک میں سماجی تعلقات اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے بھی بہت خطرناک ثابت ہورہے ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ جن مندروں کا ذکر کیا جاتا ہے اگر ان کو منہدم نہ کیا جاتا تو ملک میں مزید بے حیائی اور بدامنی اور خلفشار پھیلنے کا اندیشہ تھا۔ کیوں کہ اس عہد میں ایسے کئی مندر تھے جو بے حیائی کا اڈہ بن گیے تھے اور مفسد لوگ یہاں جمع ہوکر حکومت کے خلاف سازشیں کرتے تھے۔ ڈاکٹر ایشورٹو پانے لکھا ہے:

''اسلامی اصولوں کے نقطۂ نظر سے غیر مسلم ذمی کو یہ اختیار حاصل نہ تھا کہ وہ نئے مندر نو آباد مسلمانی علاقوں میں تعمیر کرتے۔ فیروز شاہ نے تغلق پور، صالح پور اور کوہانہ نئے شہر آباد کیے تھے، یہاں ہندوؤں نے مندر بنائے۔ یہ مندر فیروز شاہ کے حکم سے توڑے گئے۔ ان مندروں کے متعلق فتوحاتِ فیروز شاہی میں تفصیلی حالات ملتے ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ ہندو اور مسلمان تیوہاروں کے موقعہ پر، جو ان مندروں کے سلسلے میں ہوا کرتے تھے، جاتے تھے اور عورتوں کا بھی کثرت سے ان جگہوں میں آنا جانا ہوتا تھا۔ مرد اور عورت کے ملنے جلنے کی وجہ سے پبلک میں عام رسوائی کے چرچے ہوا کرتے تھے اور بد اخلاقی پھیلتی جاتی تھی۔ یہ مندر دراصل عقیدت اور مذہبیت کے گھر نہ بن سکے، بلکہ شیطان کا وہاں راج تھا۔ فیروز شاہ نے ایک طرف اسلامی قانون کے تحت اور دوسرے پبلک کی بھلائی کے پیش نظر ان مندروں کو توڑا۔ فیروز شاہ نے عام طور سے بحیثیت سرکاری پالیسی کے مندر توڑے۔''[۱۸]

اس طرح کے واقعات دوسرے عہد میں بھی ہوئے، جس کے خلاف بادشاہوں کو سخت کارروائی کرنی پڑی۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ ''جنگ کے دوران عبادت گاہوں کی بربادی ایک عام بات تھی۔ لیکن جب صلح کی صورت پیدا ہو جاتی تو ان عبادت گاہوں کی تخریب سے ہاتھ روک لیا جاتا تھا۔''[۱۹]

سلطان سکندر لودھی بھی مذہبی معاملات میں سخت واقع ہوا تھا، مگر اس نے تعصب سے کام نہیں لیا۔ اگر اس نے کسی قدر غیر مسلموں کے ساتھ سخت رویہ اپنایا تو اس کے عوامل پر بھی غور کرنا چاہیے۔ اس عہد میں ہندوؤں کی بعض ایسی جماعتیں سرگرم ہو گئی تھیں جن کا مقصد مسلمانوں کو مرتد بنانا تھا۔[۲۱] دوسری طرف یہی بادشاہ یہ بھی چاہتا تھا کہ دونوں قومیں ایک دوسرے کے علوم کو سیکھیں، تاکہ ایک دوسرے کو قریب سے سمجھ سکیں۔[۲۱] اس نے اگر تعصب سے کام لیا ہوتا تو کروکیشتر کے کنڈ کو تباہ کر دیتا، مگر مولانا عبداللہ اجودھنی نے اسے اس کام سے روکا تو وہ آگے کوئی اقدام نہ کر سکا۔[۲۲]

بعض وجوہ سے جہاں گیر نے نئے مندروں کی تعمیر پر پابندی لگا دی تھی، اس

لیے شاہ جہاں نے اپنے زمانہ میں نوتعمیر شدہ مندروں کو مسمار کروادیا تھا۔ اورنگ زیب نے بھی کئی مندر گروائے۔ مسلمان حکم رانوں نے ہنگامی حالات میں بعض مندروں کو مسمار کیا تو انہوں نے کچھ مسجدوں اور درگاہوں کو بھی تہس نہس کیا۔ اگر وہ تعصب کو جگہ دیتے تو ملک میں ایک بھی مندر بچا نہ رہتا۔ انہوں نے اسلام کے اس اصول پر عمل کیا کہ کسی کے مذہبی مقامات کو محض نفرت اور عناد کی وجہ سے ہرگز مسمار نہ کیا جائے، البتہ جو مقامات سازش اور گم راہی کے اڈے ہوں انھیں برباد کردیا جائے۔

جزیہ کا نفاذ

جب کسی نئے علاقہ کو فتح کرکے مسلمان اس پر اقتدار حاصل کرلیتے ہیں تو مفتوحین میں سے جو لوگ مسلمانوں کی حکومت تسلیم کرکے اس ملک میں رہنا چاہیں اور عہد کریں کہ وہ مملکت کے خلاف بغاوت اور سازش میں ملوث نہ ہوں گے، ان کو ذمی کی حیثیت سے تسلیم کرکے حکومت ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی بالکل اسی طرح حفاظت کرتی ہے، جس طرح مسلمان رعایا کی کرتی ہے۔ البتہ ایسے لوگوں سے مسلمان حکم راں کچھ سالانہ ٹیکس لیتے ہیں، اسے جزیہ کہا جاتا ہے۔ یہ ٹیکس انہی لوگوں سے وصول کیا جاتا ہے جو فوجی خدمت کے قابل ہوں۔ عورتیں، بچے، بوڑھے، معذور اور مذہبی خدام وغیرہ اس سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ جزیہ کی ادائیگی کے بعد اہل ذمہ سے نہ صرف فوجی خدمات ساقط ہوجاتی ہیں، بلکہ وہ اپنے مذہبی، سماجی اور عائلی معاملات میں بھی اسلامی قانون کے پابند نہیں ہوتے۔

ہندوستان میں سب سے پہلے محمد بن قاسم کے زمانہ میں، جب وہ سندھ میں اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈال رہے تھے، یہ مسئلہ پیش آیا کہ مفتوح قوم کے ساتھ کس طرح کا معاملہ کیا جائے اور شریعت کا اس بارے میں کیا حکم ہے، کیوں کہ یہاں کے باشندے شبہ اہل کتاب تھے۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی لکھتے ہیں:

''غیر مسلموں کی شرعی حیثیت کے بارے میں مذکورہ تفصیلات کی روشنی میں جہاں تک ہندوؤں کی حیثیت کا تعلق ہے، یہ مسئلہ سب سے پہلے اس وقت زیر بحث آیا

جب عظیم فاتح محمد بن قاسم کے زیر قیادت سندھ میں ۷۱۲ء میں عربوں کی حکومت قائم ہوئی۔ تاریخ سندھ کے ایک مستند ماخذ چچ نامہ کے بیان کے مطابق محمد بن قاسم نے سندھ کے ان مفتوحین (جن میں برہمن، بودھ دونوں شامل تھے) کو ذمی کی حیثیت سے تسلیم کیا اوران پر جزیہ عاید کیا، جنھوں نے اپنے قدیم مذہب پر قائم رہتے ہوئے مسلم حکومت کے زیر نگیں رہنے پر رضامندی ظاہر کی ۔اسی حیثیت سے انہیں مذہبی آزادی ملی اور قدیم مندروں کی مرمت و آبادکاری کی اجازت دی گئی۔گرچہ چچ نامہ یا کسی اور ماخذ میں اس کی صراحت نہیں ملتی ،لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ محمد بن قاسم نے والیٔ عراق اور علماء سے صلاح ومشورہ کے بعد ہی ہندوؤں کے سلسلہ میں فیصلہ لیا ہوگا، جیسا کہ اس بات کے واضح ثبوت ہیں کہ انہیں قدیم معابد کی مرمت کی اجازت دینے اور بعض دوسرے مسائل میں محمد بن قاسم نے حجاج بن یوسف سے مشورہ اور علماء سے استفسار کیا تھا۔ یہاں یہ وضاحت دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ مشہور عرب مورخ بلاذری نے صاف طور پر یہ ذکر کیا ہے کہ سندھ کی فتح کی مہم کے دوران اور بعد کے زمانوں میں بھی حجاج بن یوسف سے محمد بن قاسم کی مراسلت برابر جاری رہی اور یہ صراحت بھی کی ہے کہ ہر تیسرے روز خطوط کی آمد و رفت ہوتی رہتی تھی۔'' ۲۳

سندھ کے غیر مسلموں کی جو شرعی حیثیت متعین کی گئی، اسی قانون پر بعد کے سلاطین نے بھی عمل کیا، اور ہندوؤں سے جزیہ وصول کیا جاتا رہا۔البتہ اکبر کے زمانہ میں شروع میں تو اس پر عمل رہا، مگر بعد میں اس نے ہندوؤں کو اس سے بری کردیا۔عہدِ جہاں گیر اور شاہ جہاں میں بھی جزیہ معاف رہا۔البتہ اورنگ زیب نے اپنی حکومت کے بائیس سال بعد اس قانون کو نافذ کردیا اور اپنے انتقال سے کچھ عرصہ قبل اسے موقوف کردیا۔ اسلام کے اصول جزیہ پر جو لوگ اعتراض کرتے ہیں، اس کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد لکھتے ہیں:

''ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت تقریباً آٹھ سو سال تک رہی اور زیادہ تر زمانوں میں جزیہ وصول کیا گیا، اس کے باوجود عہد قدیم سے چلے آئے مذہبی معتقدات

اور مذہبی مقامات کی اپنی حیثیت برقرار رہی۔اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ جزیہ کی وجہ سے بڑے پیمانے پر مذہب کی تبدیلی کا عمل ہوا ہو۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو اسلام کے شیدائی اس کا بیان بڑھا چڑھا کر کرنے سے باز نہ رہتے۔'' ۲۴

غیر مسلموں سے سربراہ مملکت سالانہ جزیہ کی ایک قلیل مقدار ہی وصول کرتا تھا، اس کے برعکس مسلمانوں کو صدقہ، زکوٰۃ اور عشر ادا کرنا پڑتا تھا، جو جزیہ سے کہیں زیادہ ہوتا تھا۔ دراصل جزیہ ایک طرح کا بدل تھا جس کے ادا کرنے کے بعد ذمی تمام پابندیوں سے آزاد ہو جاتے تھے اور ساتھ ہی ان کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری سربراہ مملکت پر عائد ہو جاتی تھی۔اس کے ساتھ ہی مسلمانوں پر اور کئی اہم ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں۔ ایک تو انہیں جنگ میں حصہ لینا پڑتا، تو دوسری طرف انہیں سرحد کی حفاظت کرنی پڑتی تھی۔ آج بھی حکومت ملک میں رہنے والی ہر قوم سے سالانہ ایک متعین رقم وصول کرتی ہے۔ دراصل اس قسم کی رقم حکومت وصول نہ کرے تو پھر ملک کا نظم و نسق چلانا مشکل ہو جائے گا۔

جزیہ کی جو مقدار متعین کی گئی ہے اور جس کی تفصیل کتابوں میں ملتی ہے، اس کے مطابق محمد بن قاسم نے ہندو رعایا سے وصول کیا اور اسی اصول پر اورنگ زیب کے عہد تک عمل ہوتا رہا۔ یہ اسلام کی ایجاد نہیں ہے، بلکہ اسلام سے قبل بھی اس طرح کی رقم شاہان وقت اپنی رعایا سے وصول کرتے تھے۔اگر یہ معمولی سا ٹیکس ادا کر کے لوگ تبدیلی مذہب کا شکار ہو جاتے ہیں تو وہ اس مذہب کی کمی ہے نہ کہ شاہانِ اسلام کا جبر۔ چنانچہ علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''اب ہم پوچھتے ہیں کہ ایسا ہلکا ٹیکس جس کی مقدار اس قدر قلیل تھی، جس کے ادا کرنے سے فوجی پر خطر خدمت سے نجات مل جاتی تھی، جس کی بنیاد نوشیرواں عادل نے ڈالی تھی، کیا ایسی ناگوار چیز ہو سکتی ہے جیسی کہ اہل یورپ نے خیال کی ہے۔کیا دنیا میں ایک شخص نے بھی اس سے بچنے کے لیے اپنا مذہب چھوڑا ہوگا؟ کیا کسی نے اپنے مذہب کو ایسے ہلکے ٹیکس سے بھی کم قیمت سمجھا ہوگا؟ اگر کسی نے ایسا سمجھا تو ہم کو اس کے مذہب کے ضائع ہونے کا رنج بھی نہ کرنا چاہیے۔جو لوگ جزیہ ادا کرتے تھے، ان کو اسلام نے جس قدر حقوق دیے، کون حکومت اس سے زیادہ دے سکتی ہے۔'' ۲۵

نفاذ جزیہ کے سلسلہ میں سب سے زیادہ محمد بن قاسم، علاء الدین خلجی، فیروز شاہ تغلق اور اورنگ زیب عالم گیر کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے زبردستی غیر مسلموں پر جزیہ کا قانون نافذ کیا، جس سے ہندوؤں کی مالی حالت کمزور اور مسلمانوں کی حالت مستحکم ہوگئی۔ یہ برادران وطن کی غلط فہمی ہے کہ وہ جزیہ کی اصل غرض وغایت کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے:

''اورنگ زیب نے باتفاق جمیع علماء حنفیہ ہند ہندوؤں پر جزیہ کے احکام جاری کیے تھے۔ نادانی و بے خبری سے ہندوؤں نے سمجھا کہ یہ ان کی تذلیل وتحقیر ہے، حالاں کہ اگر اس وقت علماء محققین ہوتے اور وہ جزیہ کی غرض و غایت اور اہل ذمہ کے حقوق معتبر فی الشرع کو کھول کر بیان کرتے تو ہندوؤں کو معلوم ہوجاتا کہ ان کی تذلیل نہیں، بلکہ وہ بہتر سے بہتر سلوک ہے جو دنیا میں کوئی حاکم قوم محکوموں کے ساتھ کرسکتی ہے''۔ ۲۶

مسلم حکم رانوں کے عہد میں غیر مسلموں کے درمیان یہ ٹیکس کبھی خلجان کا باعث نہ رہا اور نہ ان لوگوں نے اسے اپنے لیے بار سمجھا، بلکہ انہوں نے اسے بخوشی قبول کیا، کیوں کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ اس طرح کے تعاون کے بغیر حکومت کا کاروبار اچھی طرح سے چلایا نہیں جاسکتا۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن فرماتے ہیں:

''اس زمانہ کے تمام راجہ اس کو اور ٹیکسوں کی طرح ایک ٹیکس سمجھ کر ادا کردیا کرتے تھے اور کسی حال میں وہ اپنے کو کمتر درجہ کا شہری تسلیم نہیں کرتے تھے، حالاں کہ اب یہی بتایا جاتا ہے کہ یہ ٹیکس غیر مسلموں کو سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور اخلاقی حیثیت سے تابع بنا کر گری ہوئی حالت میں رکھنے کے لیے عائد کیا جاتا تھا۔ مگر جب ہاتھ میں تلوار موجود تھی تو ایسا کرنے کے لیے ٹیکس لگانے کی کیا ضرورت تھی اور ایسے مورخ کی کوئی وقعت نہیں ہوگی جو یہ تسلیم نہ کرے کہ ملک گیری کے سلسلہ میں مسلمانوں کی تلوار تو خوب چمکی لیکن ملک داری میں ان کی تلوار ہمیشہ نیام میں رہی۔ وہ میدان جنگ میں خواہ کیسی ہی خوں ریزی کرتے، لیکن جنگ کے بعد معتدل روش اختیار کرلیتے۔ کیوں کہ ملک کی زراعت اور تجارت ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھی۔ اونچے عہدے دار تو مسلمان ضرور تھے،

لیکن دوسرے تمام عہدے ہندوؤں کے ہاتھوں ہی میں ہوتے تھے، کیوں کہ ان کی مدد کے بغیر حکومت کا ڈھانچہ کھڑا نہیں ہوسکتا تھا اور اگر ان کے ساتھ رودارانہ سلوک نہ کیا جاتا تو تھوڑی تعداد اور قلیل فوج کی مدد سے ہر جگہ مسلمانوں کی حکومت قائم نہیں رہ سکتی تھی۔'' ۲۷

سلاطین ہند نے غیر مسلموں کی نہ صرف طرح طرح سے حوصلہ افزائی کی، بلکہ بحیثیت ذمی ہونے کے سلطنت کے اہم عہدے ان کے سپرد کردیے تھے۔ناواقف ہندو کہتے ہیں کہ یہ فیاضی صرف اکبر کے ساتھ مخصوص تھی۔یہ بالکل غلط ہے۔جہاں گیر، شاہ جہاں یہاں تک کہ اورنگ زیب کے عہد میں بھی ہندو اہم عہدوں پر فائز تھے۔نہ ہزاری، ہفت ہزاری، چار ہزاری جیسے عہدے ان کو ملے ہوے تھے، جو فوجی عہدہ تھا۔یعنی ہر منصب کی تعداد کے اعتبار سے فوج ان کے زیر نگرانی حرکت کرتی تھی۔ ۲۸

عہد فیروز شاہی میں بھی ہندو بہت معزز ہو گیے تھے۔خود فیروز شاہ تغلق نے اپنی حکومت کو ہر قسم کے ضعف سے محفوظ رکھنے کے لیے ہندوؤں کو قریب کیا۔بعض اوقات وہ ہندو جوگیوں اور بیراگیوں کو اپنے پاس بٹھاتا اور ان سے علمی مذاکرہ کرتا تھا۔ خسرو خان نمک حرام اور خسرو خانی ہندوؤں نے اندر اندر اسلام دشمنی کا جو مظاہرہ کیا اس پر بھی سلاطین نے کوئی سخت نوٹس نہیں لیا۔ حد سے زیادہ بڑھی ہندو نوازی کا ذکر انگریز مورخوں نے بھی کیا ہے۔ پروفیسر گارڈ براؤن نے لکھا ہے:

''رہا ہندو رعایا کے ساتھ برتاؤ سوان پر سختی وسخت گیری کیسی؟ اس (محمد تغلق) نے تو اکبر سے پہلے ہی ایک طرف ستی کے رسم کو مسدود کرایا، دوسری طرف ہندو راجاؤں کو اعلیٰ جنگی مناصب اور دیگر قابل ہندوؤں کو اعلی ملکی خدمات پر فائز کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے دولت مند ہندوؤں کی دولت وثروت میں مطلق دست اندازی نہیں کی۔ برنی کا زرفرضی پر سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ اس سے ہندوؤں کی دولت مندی وتونگری میں ترقی ہوتی رہی، اس نے قدیم وجدید ہندو ریاستوں کو نیم خود مختاری کی حالت میں چھوڑے رکھا۔ اس کے طرز عمل کی دانش مندی سے وہ لوگ تو انکار کر ہی نہیں سکتے جو اکبر کے طرز حکومت کے مداح ہیں۔'' ۲۹

اسلام کی اشاعت طاقت اور اقتدار کے بل پر نہیں ہوئی

مسلم سلاطینِ ہند نے غیر مسلموں کے ساتھ رواداری کا معاملہ کیا اور انہیں آزادی سے زندگی بسر کرنے کے مواقع فراہم کیے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔ اگر اسلام جبر سے پھیلایا جاتا تو مسلمانوں کی حکومت ہندوستان سے ختم ہوتے ہی وہ سارے ہندو جنہوں نے جبراً اسلام قبول کیا تھا، اسلام سے پھر جاتے اور اپنے سابق مذہب کو اختیار کر لیتے۔ مگر تاریخ میں ایسے واقعات بہت کم ملتے ہیں کہ اسلام قبول کرنے کے بعد کوئی اس سے منحرف ہوا ہو۔ اگر جبراً اسلام پھیلایا جاتا تو آگرہ، دہلی، اودھ، بہار، دکن وغیرہ میں مسلمانوں کی تعداد ہرگز کم نہ ہوتی، کیوں کہ یہ علاقے براہ راست مرکز سے تعلق رکھتے تھے۔ آٹھ سو برس کا عرصہ گزر جانے کے باوجود وہاں مسلمانوں کی تعداد پندرہ فی صد سے زیادہ نہ بڑھی۔ اس کے برخلاف جہاں مسلمانوں کا اقتدار زیادہ مضبوط نہ تھا، ان علاقوں میں ان کی تعداد میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہوا۔ سندھ، کشمیر اور بنگال وغیرہ کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ بنگال میں اشاعت اسلام کے سلسلے میں آرنلڈ نے بڑی تفصیلی اور اہم بحث کی ہے۔ مگر یہاں پر 'اے شاٹ ہسٹری' کا مندرجہ ذیل اقتباس جو بڑا ہی معنی خیز ہے پیش کیا جا رہا ہے:

''ظن غالب یہ ہے کہ ہندومت کی پابندیوں نے بنگال کی نیچ ذاتوں کو اس نئے مذہب کے قبول کرنے پر آمادہ کر دیا تھا۔ آٹھویں صدی عیسوی سے لے کر بارہویں صدی عیسوی تک بنگال پر پال خاندان کی حکومت تھی، جو بدھ کا پیرو تھا۔ اس کے زمانہ میں نیچ ذاتوں کو بڑی آزادی حاصل تھی۔ جب سین خاندان کے لوگ جنوب کی طرف بنگال میں داخل ہوئے تو وہ اپنے ساتھ ہندومت اور اس کی تمام معاشرتی پابندیاں بھی لے آئے، جن سے نیچ ذاتوں کے جذبات کو ہمیشہ ٹھیس لگتی تھی اور جب بارہویں صدی میں اسلام آزادی اور مساوات کا ڈنکا بجاتا ہوا بنگال پہنچا تو عوام کی طبیعتیں خود بخود اس کی طرف مائل ہو گئیں۔ لوگ جوق در جوق مسلمان ہوتے چلے گئے۔ یہ ایک بڑا سبب ہے، اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے سبب کی تلاش کی حاجت نہیں''۔[۳۰]

ہندوستان میں اشاعتِ اسلام کے اسباب وعوامل

ہندوستان میں اسلام کی آمد کے وقت یہاں کے دوقدیم مذاہب ہندومت اور بدھ مت کے درمیان کش مکش جاری تھی۔جس میں بدھ مت کودوبارہ عروج حاصل ہورہا تھا۔ ان مذاہب کے رہ نما سماجی تفریق کے ناسور کا مداوا پیش کرنے سے قاصر رہے۔اگراس طرح کی برائے نام کوشش کی بھی تو اس میں انہیں کوئی کامیابی نہ مل سکی۔اس کش مکش اور سماجی تفریق کا عوام بالخصوص سماج کے پچھڑے طبقہ پر کافی اثر پڑا۔اسی درمیان اسلام اپنی صاف ستھری تعلیمات لے کر ان کے سامنے کھڑا ہوا تو عوام کونظر آیا کہ اسلام نے جو نظریۂ حیات پیش کیا ہے، اس میں بلاتفریق رنگ ونسل سب برابر ہیں۔لہٰذا وہ اپنے مذہب کو چھوڑ کر اسلام کی آغوش میں آتے چلے گئے۔اب کوئی اونچی ذات کا ہندو کسی نائر سے چھوجانے اور غسل کیے بغیر کچھ کھاپی لینے کے جرم میں غریب الوطنی ،قید اور غلامی کی صعوبتیں اٹھانے کے لیے مجبور نہ تھا۔درحقیقت اسلام کی اشاعت میں مندرجہ ذیل اسباب عوامل کارفرما تھے:

۱۔ عرب تجار کی تبلیغی مساعی۔

۲۔ سلاطین کا پے درپے ہندوستان پر حملہ اوران کے ساتھ آنے والے مسلمانوں کا یہاں کے باشندوں کے ساتھ حسن سلوک۔

۳۔ علماء کی تدریسی ،تقریری اورتحریری خدمات۔

۴۔ صوفیاء کرام کی جدوجہد۔

۵۔ انسانی مساوات کا اسلامی عقیدہ۔

۶۔ ذات پات کی تفریق سے نفرت وبیزاری۔

ان میں سے ہر عامل نے اپنے اپنے طور پر نمایاں کردار ادا کیا ہے۔لہٰذا یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ اسلام کی اشاعت تلوار کے ذریعہ نہیں ہوئی، بلکہ ان سب عوامل واسباب نے مل کر ہندوستانی سماج کو متاثر کیا ، جس کے نتیجے میں اس کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا۔

سلاطینِ ہند کا عدل وانصاف اشاعتِ دین کا اہم سبب

یہ بات درست ہے کہ سلاطینِ ہند علماء، صوفیاء اور مشائخ کی طرح دینِ اسلام کے نمائندے نہ تھے، مگر اس سے بھی مفر نہیں کہ ان کا ہر اقدام دین کے منافی نہ تھا، یا ان کا فکر کلی طور پر اسلام کے اصول ومبادی سے متضاد ومتصادم نہ تھا۔ اگر ان سلاطین میں بہت سے نااہل تھے تو بڑی تعداد ان بادشاہوں کی ہے جو دینی روح سے مزین اور عدل پرور تھے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں:

''سلاطین دہلی کی حکومت میں عدل پروری کی جو روایت قائم ہوئی اس کو مغل بادشاہوں نے اور بھی شاندار طریقے پر برقرار رکھا..... مغل بادشاہوں کا یہ دستور تھا کہ وہ دیوان عام میں عوام کی شکایتیں سنتے، جہاں ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی ان کے پاس آسانی سے پہنچ سکتا تھا۔ جو بھی چاہتا دربار عام کے سامنے حاضر ہوکر خود اپنا استغاثہ پیش کر دیتا، دربار کے عہدے دار اس کو لے کر بادشاہ کے سامنے پیش کر دیتے، بادشاہ اس کو پڑھوا کر سنتا، مدعی سے جرح کرتا اور پھر مناسب کارروائی کے لیے فیصلہ صادر کر دیتا، اگر مجرم کوئی بڑا عہدے دار یا شاہی خاندان کا بھی ہوتا تو اس کو سزائیں دینے میں تامل نہ کیا جاتا..... اسی عدل پروری کا نتیجہ تھا کہ جو سلاطین مذہبی ہوتے، انہوں نے جزیہ یا نئے مندر کے بننے اور نہ بننے کا سوال تو اٹھایا، لیکن یہاں کے غیر مسلموں پر اپنا مذہب زبردستی لادنے کی کوشش نہیں کی، وہ خود تو اسلام کے محافظ اور نگہبان ضرور رہے اور مسلمانوں کو بھی اوامر ونواہی کی پابندی کرانے کی کوشش کی، لیکن کبھی اپنی غیر مسلم رعایا کے مذہبی عقائد میں مداخلت نہیں کی اور ان کی معاشرتی زندگی کو درہم برہم نہیں کیا..... بعض فرماں رواؤں پر جبری تبلیغ کا الزام عائد کیا جاتا ہے، لیکن نئی تحقیقات سے یہ الزامات زیادہ تر بے بنیاد ثابت ہو رہے ہیں۔ ہندو مورخین لکھتے ہیں کہ یوپی چھ سو سال تک مسلمانوں کے زیر نگیں رہا، لیکن یہاں مسلمان صرف چودہ فیصدی ہیں اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندو مذہب محفوظ رہا اور جبری اشاعتِ اسلام نہیں ہوئی اور ہندوؤں کو زبوں حال نہیں بنایا گیا، تمام سلاطین اچھی طرح سمجھ گیے تھے کہ ان کا سیاسی مفاد اسی میں ہے کہ یہاں کے لوگوں

کے مذہبی اور معاشرتی نظام میں مداخلت نہ کریں۔اس رواداری کے بغیر ان کی حکومت زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتی تھی۔صوفیہ کرام نے خدمتِ خلق اللہ اور عدل پروری کی جو تعلیم دی اور خود یہاں کے غیر مسلموں کے ساتھ ان کا جو کریمانہ اور روادارانہ اخلاق رہا اس سے سلاطین کو مزید تقویت پہنچی .....''[۳۱]

ہندوستان میں اشاعت اسلام کی تاریخ پر ایک نظر

عام رجحان یہ ہے کہ اسلام کی اشاعت میں سلاطین نے ذاتی دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا۔متعصب مورخوں نے اس کے برعکس یہ باور کرایا ہے کہ انہوں نے جبراً اسلام کو پھیلایا۔'پریچنگ آف اسلام' کے مصنف آرنلڈ نے اشاعت اسلام کا پورا سہرا صوفیہ کے سر ڈالا ہے۔[۳۲] عصر حاضر کے کچھ محتاط مورخوں نے اپنی تمام بحث اس بات پر مرکوز کر دی ہے کہ اسلام کی اشاعت صوفیۂ کرام کی ترجیحات یا عمومی ذمہ داریوں سے خارج تھی۔انہوں نے اس سلسلے میں کوئی عملی جدوجہد نہیں کی۔[۳۳] اسی طرح بعض حضرات نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اسلام کی اشاعت میں علماء نے کوئی نمایاں سرگرمی نہیں دکھائی، ان کا دائرہ کار صرف تعلیم وتعلم اور تحریر وتصنیف رہا ہے۔دین کی تبلیغ کم از کم قرون وسطی کے برصغیر کی حد تک ان کے فرائض اور کاموں میں شامل دکھائی نہیں دیتی، البتہ کہیں کہیں چند مثالیں مل جاتی ہیں جو انگلیوں کے پوروں پر گنی جاسکتی ہیں۔[۳۴]

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی اشاعت میں سلاطین، صوفیہ، علماء، عرب تجار اور کسی حد تک عام مسلمان بھی شامل ہیں اور سبھوں نے اپنے اپنے دائرہ میں رہ کر اس کام کو انجام دیا ہے۔سلاطین نے ملک فتح کر کے یہاں کے باشندوں کو ایک مرکز سے جوڑا اور مسلمانوں کو ان کے درمیان رہنے کا موقع فراہم کیا۔ان کی معاشرت، تہذیب اور عادات و اطوار سے مقامی باشندے متاثر ہوئے اور اس طرح گاہے بہ گاہے وہ اسلام قبول کر کے مسلم معاشرہ میں ضم ہو گیے۔دوسری طرف ان بادشاہوں نے جب کسی علاقہ پر فتح حاصل کی تو ان کے سامنے قبول اسلام کی پیش کش رکھی جس کو بہت سے ہندوؤں نے قبول کیا۔اس کے بعد پھر یہی سلاطین مقامی باشندوں کو اعزاز واکرام سے

نوازتے جس کے اچھے اثرات پڑے، اس کی آخری شکل حلقۂ اسلام میں شمولیت تھی۔ اگر مسلمان ہندوستان میں سیاسی افق پر کم زور ہوتے تو بقول ایک ہندو دانش ور ''یہ بھی امکان تھا کہ ہندی ادیان کے گھنے جنگل میں اسلام کی شخصیت ہی گم ہوجاتی، قطع نظر اس کے مسلمانوں کی تعداد کتنی ہوتی؟'' ۳۵

اگر یہ تمام باتیں نہ ہوتیں تو پھر صوفیۂ کرام جو سلاطین وقت سے الگ تھلگ ہوکر دین کی دعوت کو عام کیے ہوئے تھے، کیسے اور کیوں کر یہاں آتے اور یہاں کے لوگ کیوں کر انہیں قال اللہ وقال الرسول کی آواز بلند کرنے کی اجازت دیتے۔ تاریخ اور تذکرہ کی کتابوں میں ایسے واقعات بکھرے پڑے ہیں کہ ان پاک نفوس کی برکت اور ان کی مساعی سے بے شمار لوگ حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ سید عابد حسین نے صوفیۂ کرام اور مبلغین عظام کے تبلیغی مشن کے سلسلے میں جو نقطۂ نظر پیش کیا ہے وہ بجا معلوم ہوتا ہے:

''حضرات صوفیا نے اپنے طور پر اس کام کا بیڑا اٹھایا، مگر ان کی راہ میں بڑی مشکلیں حائل تھیں۔ ملک کا نہایت وسیع اور زیادہ تر چھوٹے چھوٹے قریوں پر مشتمل ہونا، جو بعض علاقوں میں ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر واقع تھے، آمد و رفت کی دشواریاں، بدامنی، جنگ وجدل، اس کے علاوہ ہندو مذہب کی جڑیں مضبوطی سے لوگوں کے دلوں میں قائم تھیں، اگر چہ مسلمانوں کا معاشرتی نظام، جس میں ابھی تک اخوت ومساوات کا کچھ رنگ باقی تھا، ہندوؤں کے نچلے طبقے کو اپنی طرف کھینچتا تھا، لیکن ان کی قدامت پسندی اور وہ وحشت جو اجنبی فاتح قوم سے ہوا کرتی ہے انہیں روکتی تھی۔ اونچے طبقے عموماً اپنے مذہب سے مطمئن تھے اور اپنی سماجی حالت سے بھی۔ اس میں شک نہیں کہ صوفیوں کی جماعت نے ان ناسازگار حالات میں عام طور پر بغیر حکومت کی مدد کے محض اپنے جوش ایمانی سے تبلیغ کے میدان میں حیرت انگیز کام کیا اور زبردست کامیابی حاصل کی۔ لاکھوں کروڑوں ہندو جن میں اونچے طبقے کے بھی بہت سے لوگ شامل تھے، مسلمان ہوگئے۔ پھر بھی مسلمانوں کی تعداد غیر مسلموں کے مقابلے میں اس قدر کم رہی کہ ریاست کے لیے یک جہتی اور ہم آہنگی کی جو فضا درکار ہے وہ پیدا نہ ہوسکی۔'' ۳۶

علمائے کرام نے بھی یقیناً خالص دینی جذبے کے تحت ہی اسلامی تعلیمات کو

ہندوستان کے کونے کونے میں عام کیا۔ دراصل یہ علماء ایک ایسی کڑی کا کام انجام دے رہے تھے جس کے تانے بانے ایک طرف سلاطینِ وقت سے ملتے تھے تو دوسری طرف صوفیہ اور مشائخ کی خانقاہوں سے۔ مسئلہ صرف قبول اسلام تک محدود نہیں تھا، بلکہ اسلام قبول کرنے والوں کی تعلیم وتربیت اور دینی تفہیم کی بھی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کو علماء کرام پورا کرتے تھے۔ اسی طرح عرب تجار نے بھی ملک کے ایک حصے میں اپنے اخلاق وکردار اور صفائی معاملات کی وجہ سے اسلام کی اشاعت میں اہم کردار نبھایا۔ دراصل یہ کام ہندوستانی تناظر میں کسی ایک طبقہ کے ذریعہ ہرگز انجام نہیں پاسکتا تھا۔ اس لیے یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ اسلام کی اشاعت میں مذکورہ تمام طبقات نے حصہ لیا۔ ضرورت ہے کہ ان تمام لوگوں کی خدمات کا غیر جانبدارانہ طریقے سے مطالعہ کیا جائے۔

حواشی ومراجع

۱ اشاعت اسلام کے سلسلے میں اسلام کے احکام کیا ہیں؟ احادیث میں اس کے متعلق کیا صراحت ملتی ہے؟ خود اللہ کے رسولؐ اور صحابہ کرامؓ نے تبلیغ دین کے لیے کس طرح کی حکمت عملی اختیار کی؟ پھر بعد کے عہد میں مبلغین اسلام اور خلفائے اسلام نے اسلام کو کس انداز میں دنیا کے سامنے پیش کیا اور اسے پھیلایا؟ اس کے لیے دیکھیے راقم الحروف کا مضمون: 'اشاعت اسلام سے متعلق اسلامی احکام' ماہ نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مئی ۲۰۰۸ء

۱الف سید ابوالاعلیٰ مودودی، الجہاد فی الاسلام، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، طبع ۲۰۰۷ء، ص ۱۵ (دیباچہ اول)

۲ ابوظفر ندوی، مختصر تاریخ ہند، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۷۹ء

۳ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، برصغیر میں اسلام کی توسیع واشاعت میں صوفیائے کرام کا حصہ، سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جولائی-ستمبر ۱۹۸۵ء، ص: ۲۲..... علامہ سید سلیمان ندوی نے اس کتاب اور اس طرح کی دوسری کتابوں پر جو تنقیدی ریمارک کیا ہے وہ بڑا دل چسپ ہے، اس سے مصنفین کے عزائم کا پردہ چاک ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے: سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مقالات سلیمان، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۶۶ء، ج: ۱، ص: ۳۸۴-۳۸۵، ۳۹۰

۴ جیمس فرگیسن، اسلامی فن تعمیر ہندوستان میں، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۳۲ء، ص: ۱

۵ بشمبر ناتھ پانڈے، اسلام اور ہندوستانی ثقافت (مترجم: تقی رحیم) خدا بخش اورینٹل

پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۸ء، ص:۲۹-۳۰

۶۔ محمد اسد، اسلام دوراہے پر، آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۶۸ء، ص:۴۶-۴۷

۷۔ History of Aurangzib, Sir Jadunath Sarkar OrientLimited, N. Delhi,1972,Vol.3,P:163-190

۸۔ ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد، اورنگ زیب ایک نیا زاویۂ نظر، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۴ء، ص:۴ دیباچہ

۹۔ ایضاً.....اس کے برعکس ڈاکٹر ستیش چندر کی کتاب 'مغل دربار کی گروہ بندیاں اور ان کی سیاست'، محمد اطہر علی کی 'اورنگ زیب کے عہد میں مغل امرا'، 'تاریخ شاہ جہاں' ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ اور رومیلا تھاپر کی کتاب کافی حد تک حقائق پر مبنی معلوم ہوتی ہیں، جن میں سلاطین ہند کی ہندو نوازیت اور دوسرے اہم گوشوں پر منصفانہ مواد جمع کیا گیا ہے۔

۱۰۔ History of Aurangzib,Vol:5,P:474 بحوالہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، بزم تیموریہ، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۹۰ء، ج:۱، ص:۲۲۲

۱۱۔ History of Aurangzib,Vol:3 P:253 بحوالہ بزم تیموریہ، ج:۱، ص:۲۲۲

۱۲۔ مغل ایڈمنسٹریشن، ص:۱۲۹-۱۳۰، بحوالہ: اسلام اور ہندوستانی ثقافت، ص:۲۰

۱۳۔ ہسٹری آف انڈیا، ص:۸۳، ج:۳، بحوالہ اسلام اور ہندوستانی ثقافت، ص:۳

۱۴۔ ہندوستان کی مختصر تاریخ (الفنسٹن)، بحوالہ بسمبر ناتھ پانڈے، ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایت، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۸ء، ص:۱۲

۱۵۔ ایشوری پرشاد، میڈول انڈیا، ص:۱۱۰-۱۱۱، بحوالہ اسلام اور ہندوسانی ثقافت، ص:۱۱-۱۲ .....سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکم رانوں کی مذہبی رواداری، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۷۵ء، ج:۱، ص:۲۹

۱۶۔ سعید احمد اکبرآبادی، نفثۃ المصدور اور ہندوستان کی شرعی حیثیت، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۶۸ء، ص:۵۷

۱۷۔ اسلام اور ہندوستانی ثقافت، ص:۲۳-۴۵.....ایسے متعدد فرامین شعبۂ مخطوطات مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہیں۔ خدا بخش لائبریری نے ایسے بہت سے فرامین کو عہد بہ عہد جمع کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو: تاریخ ہند عہد وسطی میں (مجموعۂ مقالات) خدا بخش اورینٹل پبلک لائبری، پٹنہ، ۱۹۹۹ء، ص:۲۰۷-۲۷۹

۱۸۔ ایشور ٹوپا، ہندی مسلمان حکم رانوں کے سیاسی اصول، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، ۱۹۶۲ء، ص:۸۹

۱۹ خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۵۸ء، ص: ۴۴۹
۲۰ ایضاً، ص: ۴۴۹
۲۱ ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایات، ص: ۱۳
۲۲ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص: ۴۵۲-۴۵۳
۲۳ ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، ہندوؤں کے ساتھ سلطان فیروز تغلق کا برتاؤ، سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جولائی-ستمبر ۱۹۹۳ء، ص: ۳۸
ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، اسلامی قوانین کی ترویج وتنفیذ: عہد فیروز شاہی میں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ص: ۳۷
مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: بلاذری کی فتوح البلدان، بہ ضمن فتوحات سندھ اور علی بن حامد کوفی کی فتح نامہ سندھ معروف بہ چچ نامہ
۲۴ اورنگ زیب ایک نیا زاویۂ نظر، ص: ۴۰-۴۱
۲۵ شبلی نعمانی، مقالات شبلی، مکتبہ معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء، ج: ۱، ص: ۲۳۱
۲۶ ابوالکلام آزاد، جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد، مکتبہ ماحول، کراچی، ۱۹۶۴ء، ص: ۸۴
۲۷ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، مطبع معادف، اعظم گڑھ، ۱۹۶۴ء، ص: ۴۶
۲۸ مقالات شبلی، ج: ۱، ص: ۲۲۰
۲۹ ماہ نامہ معارف، اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۲۰ء، ص: ۴۶-۴۷، مضمون: محمد تغلق کا دور حکومت،
۳۰ اے شارٹ ہسٹری، ص: ۲۱۸-۲۱۹ ترجمہ اردو: مختصر تاریخ ہند، یوسف کوکن عمری، ص: ۲۱۸-۲۱۹
۳۱ ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، ص: ۱۰۹-۱۱۲ (تلخیص)
۳۲ ٹی۔ڈبلو۔آرنلڈ، دعوت اسلام (مترجم: محمد عنایت اللہ) مطبع فیض عام، آگرہ، ۱۸۹۸ء، ص: ۲۷۱-۳۱۴
۳۳ ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی، برصغیر میں اسلام کی توسیع و اشاعت میں صوفیائے کرام کا حصہ، سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جولائی-ستمبر ۱۹۸۵ء، ص: ۱۹-۴۶
۳۴ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی، برصغیر میں اشاعت اسلام، سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جنوری-مارچ ۱۹۸۷ء، ص: ۴۵-۶۸
۳۵ این۔سی۔مہتا، ہندوستانی تہذیب میں اسلام کا حصہ، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۳۵ء، ص: ۱۰
۳۶ سید عابد حسین، قومی تہذیب کا مسئلہ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۱۹۹۸ء، ص: ۷۲-۷۳